تصحیح جسّاسہ حدیث

ایک معاصر کے حدیث جساسہ کو قطعاً نا قابل اعتبار
ٹھہرانے کا اصول محدثین کی روشنی میں مکمل تردید

از
مولانا نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث
دارالعلوم دیوبند

ناشر
مکتبۃ النعمۃ، دیوبند سہارنپور یوپی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرات علماء کرام وارباب مدارس زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بلاتمہید عرض ہے کہ چند ماہ پیشتر ایک حدیث کے طالب علم نے مجھ سے کہا کہ "تحفۃ الالمعی" شرح جامع ترمذی اردو میں حدیث جساسہ کو قطعاً ناقابل اعتبار بتایا گیا ہے، طالب علم کی اس بات پر مجھے تردد ہوا کہ "تحفۃ الالمعی" ایک ذمہ دار عالم کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس حدیث کو قطعاً ناقابل اعتبار لکھ دیں، وہ طالب علم کتاب لے آیا اور اس کی عبارت پڑھ کر سنایا، سن کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ ایک ایسی حدیث جو سنن ثلاثہ میں موجود ہے، اور امام ترمذی نے اس کی تحسین وتصحیح کی ہے، مزید برآں یہ حدیث صحیح مسلم شریف میں بھی ہے، اور جن صاحب نظر محدثین نے صحیح مسلم کی تمام حدیثوں کی تحقیق کر کے اس کی بعض احادیث پر نقد کیا ہے یہ حدیث ان تنقید شدہ احادیث میں بھی نہیں ہے، پھر یہ کس طرح لکھ دیا گیا کہ یہ حدیث قطعاً ناقابل اعتبار ہے، اس حدیث پر یہ حکم لگانے کے لئے ایسی دلیل بھی نہیں ذکر کر رہے ہیں، جس طرح کی دلیل محدثین وعلماء کسی حدیث کی تضعیف وتغلیط کے لیے ذکر کرتے ہیں۔

اسی دوران ایک دن جامع رشید میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ سے ملاقات ہوگئی اور حدیث جساسہ کا ذکر آ گیا، اس وقت وہاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی استاذ دارالعلوم بھی موجود تھے انھوں نے بتایا کہ صاحب تحفہ کی ایک نئی کتاب "علمی خطبات" کے نام سے آئی ہے، جس کی ایک تقریر میں حدیث وسنت کے درمیان فرق کرتے

ہوئے کہا گیا ہے کہ "حجت سنت ہے حدیث نہیں" نیز یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حدیث کے حجت ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے، ساتھ ہی موصوف نے یہ اطلاع دی کہ میں نے ان کی تقریر کا علمی جائزہ مرتب کیا ہے جو عنقریب انشاء اللہ شائع ہو جائے گا، اس پر حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب نے فرمایا کہ ایسی بات لکھ کر انھوں نے کیسے شائع کر دی، پھر بھی میری رائے ہے کہ آپ لوگ مولانا موصوف سے زبانی افہام وتفہیم کر لیں، مجھے توقع ہے کہ وہ اپنی بات سے رجوع کر کے اس کو مشتہر کر دیں گے اور آئندہ ایڈیشن سے اسے نکال دیں گے۔

پھر مسئلہ کی نزاکت کو محسوس کر کے انھوں نے خود ہی دوڑ دھوپ کر کے اس وقت موجود کارگزار مہتمم حضرت مولانا غلام رسول خاموش صاحب مدظلہ کو آمادہ کیا کہ ہم سب کو جمع کر کے زبانی گفتگو کرا دیں، پھر دو دن کے بعد حضرت مولانا سید ارشد صاحب کا فون آیا کہ کارگزار مہتمم صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا موصوف سے گفتگو کی وہ کہتے ہیں کہ میں ان کے دلائل دیکھ کر فیصلہ کروں گا، اگر مطمئن ہو گیا تو رجوع کر کے شائع کر دوں گا۔

چونکہ حدیث جساسہ محدثین کے نزدیک صحیح ہے اور آج تک کسی محدث اور معتبر عالم نے اس کی تضعیف وتغلیط نہیں کی ہے صرف صاحب تحفۃ الالمعی کی یہ اپنی رائے ہے، اور جن وجوہ سے انھوں نے یہ رائے قائم کی ہے اس کو تفصیل کے ساتھ نمبروار کتاب میں درج کر دیا ہے، اس لئے میں نے بھی صرف ان وجوہ کی نمبروار تردید پر اکتفا کیا ہے البتہ ساتھ ہی ان کے طریقۂ تغلیط، نیز موجودہ دور کے علماء کا فن حدیث میں کیا مقام ومرتبہ ہے اس جانب بھی توجہ دلائی ہے۔ پھر ایک تحریر میں نے اس وقت موجود حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم کو دی جس میں حضرت مولانا سید ارشد مدنی کی مساعی اور حضرت مولانا خاموش صاحب کی ہم سب کو ایک جگہ جمع کرنے پر آمادگی، نیز مولانا موصوف کا اس پر جواب سب واضح کر دیا تھا۔

میری یہ مکمل تحریر حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے ذریعہ موصوف تک پہنچی، حضرت مہتمم صاحب نے میری تحریر موصوف کے پاس بھیج دی اور اس تحریر کے ارسال کرتے وقت ایک مراسلہ میں یہ وضاحت فرما دی تھی کہ آپ اس تحریر کا جواب لکھ کر حضرت مولانا

خاموش صاحب کارگزار مہتمم کے حوالہ فرمادیں۔

کچھ دنوں کے بعد حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے مجھ سے فرمایا کہ مولانا موصوف کا کوئی جواب نہ مجھے ملا اور نہ ہی خاموش صاحب کو، اس سب کے بعد ابھی دو ہفتہ پہلے امتحان داخلہ کے موقع پر مولانا سید ارشد مدنی صاحب نے آں موصوف سے براہ راست گفتگو کی اور فرمایا کہ میرے نزدیک مناسب یہی ہے کہ باہم بیٹھ کر اس مسئلہ کا تصفیہ کرلیا جائے اور آپ بہتر سمجھیں تو میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاؤں، مگر موصوف اس بار بھی ایک ساتھ بیٹھ کر افہام وتفہیم پر راضی نہیں ہوئے۔

اب جبکہ تقریباً ڈھائی تین ماہ کا عرصہ گذر گیا نہ موصوف کا کوئی تحریری جواب آیا اور نہ ہی باہم گفتگو پر راضی ہیں جبکہ معاملہ ایک ایسی صحیح حدیث رسول کا ہے جو ایک کے بجائے چار چار صحابہ یعنی حضرت فاطمہ بنت قیس، حضرت جابر، حضرت ابو ہریرہ، حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، ایسی حدیث کا انکار کیا جارہا ہے اور یہ انکار جن دلائل کی بنیاد پر کیا گیا ہے وہ دجال سے متعلق دیگر احادیث کی تکذیب کا ذریعہ بن سکتا ہے جبکہ موجودہ دور میں گمراہ قسم کے لوگ دجال سے متعلق اکثر حدیثوں کا انکار کرتے ہیں اور آج کل یہ بحث اخبارات میں بھی آرہی ہے۔

حضرات علماء کرام، اب اسی قسم کی بات پہلی مرتبہ اس طرح آرہی ہے جس کی زد ہم سب پر پڑے بغیر نہیں رہ سکتی، عوام، طلبۂ مدارس، بلکہ اہل علم کے بعض طبقات کا اس سے متاثر ہوجانے کا قوی اندیشہ ہے۔

اسی لئے حضرات ائمہ حدیث (اللہ ان کو جزائے خیر دے) طلبہ کو فتنہ سے محفوظ رکھنے کی غرض سے بدعت مفسقہ میں مبتلا شخص سے حدیث کی روایت کرنے سے منع کرتے ہیں، تاکہ طلبہ کا ان سے اختلاط نہ ہو لیکن ایسے راوی حدیث کے انتقال کے بعد ایسی روایت کو جس کی سند میں وہ ہوتا ہے قبول کرتے ہیں اور اس کی روایت سے منع نہیں کرتے کیونکہ اب اختلاط کا اندیشہ باقی نہیں رہا۔

عام مسلمانوں کو غلطی میں مبتلا ہونے سے بچانے کی غرض سے ضروری معلوم ہوا کہ

صاحب تحفۃ الالمعی کے موقف کی تردید شائع کردی جائے، اور ان کے فکر وفہم کی کوتاہی سے لوگوں کو آگاہ کردیا جائے اس لئے وہ تحریر جو بذریعہ حضرت مہتمم صاحب ان کو دی گئی تھی اس کی نقل شائع کی جارہی ہے۔

حضرات علماء کرام یہ فتنہ کا دور ہے، اس میں ہماری معمولی سی سہل پسندی سے بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ احادیث رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام پر جس طرف سے بھی دانستہ یا غیر دانستہ طور پر حملہ ہو اس کی مدافعت کے لیے ہمہ وقت تیار رہیں۔ بالخصوص طلبۂ علوم دین کی تعلیم وتربیت اس نہج سے کریں کہ وہ اسلاف کے دامن سے وابستہ رہنے ہی کو سعادت باور کریں اور نئے زمانہ کی نئی تحقیقوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں کیونکہ یہ تحقیقات بالعموم حق سے منحرف ہوتی ہیں۔

''الا ماشاء اللہ''

وما ارید الا الاصلاح وما توفیقی الا باللہ وعلیہ توکلت والیہ انیب

نعمت اللہ

خادم التدریس دار العلوم دیوبند

حدیث جساسہ کی تغلیط کی تردید

عبارت از اصل کتاب تحفۃ الالمعی جلد نمبر ۵، صفحہ نمبر ۶۲۷ مع جواب:-

تحفہ کی عبارت:

''اس روایت کا پہلا مضمون حضرت عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نے رد کر دیا، اور احناف نے بھی اس کو نہیں لیا۔ اور دوسرا مضمون بھی اپنے داخلی اور خارجی تناقضات کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے، یہ روایت اس کے تمام طرق کے ساتھ علامہ ابن کثیرؒ نے النہایہ (۹۳/۱) میں جمع کی ہے۔ اس کی روشنی میں اس روایت کے تناقضات درج ذیل ہیں:

(۱) امام مسلم نے کتاب الطلاق باب (۲) حدیث () میں متعدد طرق سے یہ روایت بیان کی ہے، ان کے شوہر ابوعمرو بن حفصؓ حضرت علیؓ کے ساتھ یمن کی طرف گئے تھے، اور وہاں سے انھوں نے حضرت فاطمہؓ کو تیسری طلاق بھیجی جو باقی رہ گئی تھی، اور شوہر کے کارندے نے عدت کے خرچ کے لیے جو پیش کیا، انھوں نے منظور نہیں کیا اور نبی ﷺ سے شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "لیس لك علیه نفقة" اور مسلم کی دوسری روایت ۲۹۴۲ میں یہ ہے کہ ان کے شوہر اسلام کے ابتدائی جہاد میں نبی ﷺ کے ساتھ شہید ہو گئے تھے، یہ دونوں باتیں متناقض ہیں۔'' انتہی

جواب: اس اعتراض کے سلسلے میں عرض ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کے شوہر کے طلاق دینے کے باب میں آپ کی ذکر کردہ روایات کے علاوہ بھی مختلف احادیث موجود ہیں، مگر آپ کا یہ قول: ''اس روایت کا پہلا مضمون حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ نے رد کر دیا ہے اور احناف نے بھی اس کو نہیں لیا ہے''، اس میں پہلے مضمون سے کیا مراد ہے، کیا مکمل واقعہ کا انکار، یا اس مضمون کے ایک جزء "لا نفقة لها ولا سكنى" کا؟ تو یہ بات روایات میں مصرح ہے کہ مکمل واقعہ کا انکار نہیں بلکہ اس کے ایک جزء اور ٹکڑے کے

رد اور انکار کا معاملہ ہے، اور وہ بھی اس بناء پر نہیں کہ حضرت فاطمہ کا قول لائق اعتبار نہیں تھا، بلکہ اس بناء پر کہ ان کے اس ٹکڑے کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے معارضہ تھا، چنانچہ اسی مسلم شریف میں ہے: تحدث الشعبی بحدیث فاطمة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يجعل لها السكنى والنفقة، ثم اخذ الاسود كفا من حصى فحصبه به، فقال: ويلك! تحدث بمثل هذا، قال عمر: لا نترك كتاب الله وسنة نبينا صلى الله عليه وسلم بقول امرأة، لا ندرى لعلها حفظت او نسيت، لها السكنى والنفقة، قال الله تعالى: لا تخرجوهن من بيوتهن، الاية، اسی طرح حضرت عائشہؓ سے مروی ہے: قالت: مالفاطمة خير ان تذكر هذا، تعنى قولها: "لاسكنى ولا نفقة".

الغرض ان صحابہ کا انکار صرف ایک ٹکڑے پر وارد ہوتا ہے اور وہ بھی محض معارضہ کی بناء پر کیوں کہ اس کو رد کرنے والے نے خود ہی اس کی صراحت کر دی ہے کہ ان کا یہ بیان حکم الٰہی سے متعارض ہے، لہٰذا اسے قبول نہیں کیا جا سکتا ہے، پھر حضرت فاروق اعظم نے ان کی اس بات کو رد کرنے کے ساتھ ان کے حفظ وفہم پر بھی آنچ نہیں آنے دی بلکہ اسے اپنے عدم علم پر محمول کر لیا۔ اس لیے حضرت فاطمہ کی اس روایت میں باہم تعارض واختلاف کا اثر ان کی دوسری روایتوں پر جن میں جساسہ کی روایت بھی شامل ہے، کیا پڑے گا؟ حدیث جساسہ کو قطعاً غلط بتانے کے لیے ان کی ذات کو معرض بحث میں لانا بجائے خود غلط ہے۔

تحفہ کی عبارت:

(۲) ''کتاب الطلاق کی روایت میں ہے کہ عدت کے بعد ان کے پاس حضرت معاویہؓ اور حضرت ابوجہمؓ نے منگنی بھیجی اور کتاب الفتن کی روایت میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے منگنی بھیجی''۔

(۳) ''کتاب الطلاق کی روایات میں ہے کہ نبی ﷺ نے عدت کے بعد حضرت اسامہ کی منگنی ڈالی، اور کتاب الفتن کی روایات میں ہے کہ پہلے منگنی ڈالی''۔ (انتہی)

جواب: اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جب کسی روایت میں کلمۂ حصر اور ماعدا کی نفی کا تذکرہ ہی نہیں ہے، تو حضرت معاویہؓ اور ابوجہمؓ کے پیغام نکاح دینے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے پیغام دینے میں کیا تناقض ہے، کیا عدم ذکر عدم شئ اور ماعدا کی نفی کو مستلزم ہوتا ہے؟

اس اعتراض کے سلسلے میں یہ بتایا جائے کہ ''پہلے منگنی دینے'' کا مفہوم کتاب الفتن کی روایت کے کس جزء اور لفظ سے مترشح ہوتا ہے، کتاب الفتن کی روایت میں تو اس مفہوم کا کہیں ذکر نہیں ہے، البتہ بذریعہ واؤ عطف اس جملے کا ذکر پہلے ہے، جو عطف الجملہ علی الجملہ کے قبیل سے ہے، تو کیا واؤ ترتیب کا بھی متقاضی ہوتا ہے؟

بادی النظر سے پیدا شدہ اس طرح کے تناقضات کا شراح حدیث جواب بھی دیتے ہیں، پھر اگر بالفرض مذکورہ تناقضات حدیث کے اس پہلے مضمون میں ثابت بھی ہوں، تو ''حدیث جساسہ قطعاً قابل اعتبار نہیں ہے'' کے دعوے سے اس کو کیا تعلق ہے؟ کیا یہ باور کرانا مقصود ہے کہ حدیث کے ایک مضمون کا متناقض ہونا دوسرے مضمون پر بھی یقیناً اثر انداز ہوگا؟ اور اگر ان تناقضات کا ذکر محض پیدا کردہ احتمالات وتناقضات کی تعداد میں اضافہ کے پیش نظر ہے تو پھر اور بات ہے۔

اصل عبارت:

(۴) ''مسلم کی روایت میں یہ ہے کہ دجال سے ملاقات کا واقعہ خود حضرت تمیم داری کا ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: "حدثنی انه رکب فی سفینة بحریة مع ثلاثین رجلا من لخم وجذام"، اور مسلم ہی میں سیار ابوالحکم کی روایت میں ہے: "ان بنی عم تمیم الداری رکبوا فی البحر" یعنی سفر میں حضرت تمیم داری کے عم زاد گئے تھے، خود حضرت تمیم نہیں گئے تھے، اور مسلم ہی میں یہ بھی ہے: "حدثنی تمیم الداری ان ناسا من قومه کانوا فی البحر"، اور مسند احمد میں ہے: "اخبرنی ان رهطا من بنی عمه رکبوا فی البحر" پس اگر صاحب واقعہ حضرت تمیم داری نہیں ہیں تو بیچ میں مجہول واسطے ہیں''۔

جواب: اس اشکال کے جواب میں عرض ہے کہ سیار ابوالحکم کی روایت میں آپ

نے یعنی کہہ کر: ''خود حضرت تمیم نہیں گئے تھے''، یہ کس عبارت کا ترجمہ کیا ہے؟ اس طرح کی بات تو کسی بھی روایت میں نہیں ہے، رہا راویوں کا کبھی حضرت تمیم اور کبھی بنوعم وغیرہ کو ذکر کرنے میں اختلاف تو یہ محض تعبیری اختلاف ہے، جب ایک روایت میں خود حضرت تمیم کے سفر میں جانے کا تذکرہ ہے تو ان روایات کا مجموعی مفہوم یہی ہوگا کہ ان کا یہ سفر اپنے چچازاد بھائیوں کی معیت میں ہوا تھا، ثقہ رواۃ کی روایات میں اس قسم کے تعبیری اختلاف میں شراح حدیث اسی طرح تطبیق دیتے رہے ہیں، لہٰذا مذکورہ تمام روایات باہم موافق ومطابق ہیں، ان میں زبردستی تعارض ظاہر کرکے یہ کہنا کہ ''روایت قطعاً قابل اعتبار نہیں ہے'' یہ پسندیدہ سعی نہیں کہی جاسکتی، بلکہ یہ حد درجہ غلط طریقہ ہے۔

آگے آپ نے فرمایا کہ: ''پھر اگر صاحب واقعہ خود حضرت تمیم داری نہیں تو بیچ میں واسطے مجہول ہیں'' آپ خود غور فرمائیں کہ اگر حضرت تمیم داری ہم سے یا آپ سے بیان کرتے، تو ہم آپ یہ بات کہہ سکتے تھے، کہ واسطے مجہول ہیں معلوم نہیں کہ وہ کون ہیں، ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، اور واسطہ کی یہ جہالت مضر ہوتی، مگر یہاں تو حضرت تمیم براہ راست رسول اللہ ﷺ سے بیان کررہے ہیں، اور آپ ﷺ اس کی تصدیق وتائید فرمارہے ہیں، آپ ﷺ کی اس تصدیق وتائید کے بعد واسطوں کے معلوم یا مجہول ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا آپ ﷺ کی تصدیق کافی نہیں ہے؟

اصل عبارت:

(۵) ''یہ واقعہ صحابہ کو کس نے سنایا، نبی علیہ السلام نے یا خود حضرت تمیم داری نے؟ عام روایات میں یہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے یہ واقعہ روایت کیا، مگر مسند ابویعلی میں ہے کہ خود حضرت تمیم داری کی زبانی آپ نے لوگوں کو یہ واقعہ سنوایا: قال: حدثنی تمیم، فرای تمیما فی ناحیة المسجد فقال: یا تمیم! حدث الناس ما حدثتنی، قال: کنا فی جزیرة، الخ'' (انتہی)

جواب: اس اشکال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ مسند ابویعلی کی اس روایت میں آپ ﷺ کے فرمان ''حدثنی تمیم'' میں کوئی صراحت نہیں ہے کہ حضرت تمیم نے حضور صلی

اللہ علیہ وسلم سے کیا بیان کیا، بغیر ماحدث بہ کی صراحت ووضاحت کے دونوں روایتوں میں اختلاف وتعارض کیوں کر تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ نیز ان دونوں روایتوں میں مجلس سماع کے تعدد کا بھی احتمال ہے، اس کے ہوتے ہوئے تعارض کیسے ہوگا؟ پھر اس واقعہ کو صحابہ سے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت تمیم داری نے آپ ﷺ کی موجودگی میں بیان کیا ہو، تو حضرت تمیم کے بیان کی تقریر آپ ﷺ سے ہوگئی، اب خود آپ ﷺ کے سنانے یا تمیم کے سنانے کے اختلاف سے نفس حدیث پر کیا اثر پڑے گا؟ علاوہ ازیں اس تعارض کو ثابت کرنے کے چکر میں آپ نے مسند ابویعلی کی اس روایت کے درجہ اور اس کے حکم کو بھی نظر انداز کر دیا کہ یہ روایت "غریب جدًا" ہے، جمہور محدثین کے مذہب کے مطابق حدیثِ مسلم سے روایت مسند ابویعلی کا معارضہ نہیں ہوسکتا، کیوں کہ معارضہ کے لیے دونوں کا مساوی ہونا ضروری ہے، جبکہ صحیح مسلم اور مسند ابویعلی میں مساوات نہیں ہے، تو پھر صحیح مسلم کی حدیث کے مقابلہ میں اس غریب جداً روایت کے بارے میں آپ کا یہ معارضہ کیونکر درست ہوگا۔

اصل عبارت:

(۶) ''عام روایت میں ہے "انطلقوا إلى هذا الرجل بالدير"، دیر کے معنی ہیں راہب خانہ، عیسائی درویشوں کی خانقاہ، اور ابوداؤد کی روایت (۳۴۲۵) میں ہے: اذهب إلى ذلك القصر، اور قصر کے معنی ہیں محل''۔ (انتہی)

جواب: جب آپ کو یہ تسلیم ہے کہ عام روایات میں ''دیر'' کا لفظ ہے، اور ابوداؤد کی روایت میں ''قصر'' کا، تو اس اختلافِ لفظ سے روایت کی صحت پر کیا اثر پڑے گا؟ اس عمارت کے معبد ہونے کا لحاظ کر کے اسے ''دیر'' سے تعبیر کیا گیا ہے جو بالکل درست استعمال ہے، اور اس ''دیر'' کے عظیم ووسیع ہونے کے اعتبار سے اسے ''قصر'' کہہ دیا گیا، کیوں کہ قصر کا لغوی معنی "بيت فخم واسع" ہے، آخر اس میں کیا سبب ضعف ہے کہ اسے بھی وجوہ ضعف میں شمار کیا گیا ہے؟ پھر اگر دونوں لفظ آپ کے بقول باہم متناقض ومتعارض ہیں، تو اس ایک لفظِ متعارض کی وجہ سے کس اصول کی بنا پر پوری حدیث قطعاً

ناقابل اعتبار ہو جائے گی؟

اصل عبارت:

(۷) ''اگر یہ روایت صحیح ہے تو ابن صیاد کی جانچ والی روایت بے معنی ہو جاتی ہے، حالانکہ ابن صیاد والی روایت متفق علیہ ہے، اور اس روایت کے دونوں مضمون صرف مسلم میں ہیں، امام بخاری نے صرف الخ'' (انتہی)

جواب: سوال یہ ہے کہ حدیث جساسہ کے صحیح ہونے کی صورت میں ابن صیاد کی جانچ والی روایت کے بے معنی ہونے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے اس کی کوئی وضاحت نہیں فرمائی، اور شاید آپ اس کو بیان کرنا بھی نہیں چاہتے اس لیے کہ اگر اس کو بیان کرتے تو بے معنی کہنے کی لغویت خود واضح ہو جاتی، اس ساتویں اعتراض کے جواب میں چند باتیں عرض ہیں:

(۱) جب آپ نے یہ تحریر کر دیا کہ ''حدیث جساسہ بعد کی ہے، اس لیے کہ تمیم داری ۹ھ میں مسلمان ہوئے اور مدینہ آکر حدیث بیان کیا''، یعنی ابن صیاد کے دجالِ اکبر ہونے نہ ہونے کے سلسلے میں جانچ اور تحقیق پہلے کی بات ہے، حدیث جساسہ کے بعد جب معلوم ہو گیا کہ دجالِ اکبر تو ایک جزیرہ میں مقید ہے، تو پھر ابن صیاد کے سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں کی، یہ بات لکھ کر آپ نے اس مذکورہ بنیاد پر حدیث جساسہ کے غلط ہونے کے احتمال کو باطل کر دیا تو پھر اس کو وجوہِ ضعف میں ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے؟

(۲) تغلیطِ حدیث کے لیے وجہِ تغلیط کا حتمی ہونا ضروری ہے، اور آپ نے مذکورہ بالا وجہ کو خود ہی احتمال کے درجہ میں بیان کیا ہے، یعنی اگر جساسہ پہلے کی ہو تو ابن صیاد والی روایت بے معنی ہوگی ورنہ نہیں، تو کیا اس احتمالی وجہ سے حدیث صحیح کی تغلیط ہو سکتی ہے؟

(۳) آپ نے حدیث جساسہ کے قطعاً ناقابلِ اعتبار، اور حدیث ابن صیاد کے صحیح ہونے کی ایک دلیل یہ بیان کی ہے کہ ابن صیاد کی روایت متفق علیہ ہے، اور جساسہ کی روایت صرف مسلم میں ہے، امام بخاری نے حدیث کے اس جزء کو بیان نہیں کیا ہے، تو کیا امام بخاری کا کسی حدیث کی تخریج نہ کرنا اس حدیث کی تغلیط کے لیے کافی ہے؟ خود امام

بخاریؒ یا کسی محدث نے اس طرح کی بات کہی ہے؟ امام بخاریؒ تو اس بات کے مدعی ہیں کہ جن احادیث کی میں نے تخریج کی ہیں وہ صحیح ہیں، البتہ تمام روایاتِ صحیحہ کی تخریج کے وہ قطعاً مدعی نہیں ہیں، لہٰذا ان کے عدمِ اخراج سے اس حدیث کی صحت غبار آلود نہیں ہوگی۔

(۴) یہ بات تقریباً متعین ہے کہ حدیث جساسہ، ابن صیاد کی جانچ والی روایات کے بعد کی ہے، مگر پھر بھی اس کی تغلیط کے لیے آنجناب فرماتے ہیں: کہ ''اس واقعہ کے بعد (حدیث جساسہ کے بعد) صحابہ آخر تک ابن صیاد کے بارے میں شک میں کیوں مبتلا رہے؟ اس واقعے کے بعد تو ان کا ذہن صاف ہوجانا چاہئے تھا''، آہ، صحابہ کے ذہن صاف نہ ہونے کی آپ نے کوئی وضاحت نہیں فرمائی، اسی طرح آپ نے ''صحابہ آخر تک شک میں کیوں مبتلا رہے'' کا لفظ استعمال کیا ہے، تو کیا تمام صحابہ کا یہ حال تھا یا بعض کا؟ اور جن کا ذہن صاف نہیں تھا ان کو حدیث جساسہ معلوم تھی یا نہ تھی؟ اس بابت آپ نے کوئی تفصیل بیان نہیں کیا، بلکہ آپ نے تو صحابہؓ کے اس شک کو بھی ظاہر نہیں فرمایا جو حدیث جساسہ سے زائل ہوجانا چاہئے تھا، اور اس طرح کی مبہم باتوں سے حدیث صحیح کی تغلیط پر آمادہ ہیں۔

(۵) صحابۂ کرام میں حضرت جابر اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما یہ کہتے تھے کہ ابن صیاد وہی ہے جو آگے چل کر دجالِ اکبر ہوگا، اور دوسرے حضرات اس پر مطمئن تھے کہ ابن صائد وہ دجالِ اکبر نہیں ہے جو اپنے وقتِ موعود پر ظاہر ہوگا، بلکہ دونوں الگ الگ ہیں، چنانچہ حضرت جابرؓ کی روایت ابوداؤد شریف میں ہے، جس کو حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حدیث حسن کہا ہے، اس روایت میں واقعۂ جساسہ کا بیان بھی ہے اور راوی حدیث ابوسلمہ کہتے ہیں "شهد جابر أنه هو ابن الصائد، قلت: فإنه قد مات، قال: وإن مات، قلت: فإنه قد أسلم، قال: وإن أسلم، قلت: فإنه قد دخل المدينة، قال: وإن دخل المدينة. جب صحابہ کا یہ حال تھا تو پھر ''صحابہ آخر تک'' الخ کی بات کیا معنی رکھتی ہے؟

(۶) کسی حدیث کی صحت کے لیے یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اس کے

مضمون سے مطمئن ہوجائے، تو اس عدم اطمینان کو وجوہ تغلیط میں بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۷) اگر آپ کے قول کے بموجب حدیثِ جساسہ کے باوجود صحابہ کا ذہن صاف نہیں ہوا، اس لیے حدیث جساسہ غلط ہے، تو ہم پوچھتے ہیں کہ یہ علت تو ان تمام احادیث میں موجود ہے جن سے دجال کی شخصیت متعین و مشخص ہوجاتی ہے، تو اس سے صحابہ کا ذہن مطمئن ہوجانا چاہئے تھا مگر ان روایات کے باوجود صحابہ کا ذہن مطمئن نہیں ہوا جیسا کہ آپ کے قول: ''صحابہ آخر تک شک میں'' الخ سے ظاہر ہوتا ہے، تو آنجناب ان روایات کے بارے میں کیا ارشاد فرمائیں گے؟

اصل عبارت:

(۸) اور روایت کا یہ جملہ تو عجیب ہے: لا ندری ما قبلها من دبرها، یعنی اس کی قبل اور دبر میں ہم امتیاز نہیں کر پا رہے تھے، حالانکہ یہ دونوں اعضاء جانوروں میں عام طور پر ساتھ ساتھ ہوتے ہیں، ہاں اگر راوی کہتا کہ اس کا منھ کدھر تھا اور دم کدھر تھی، اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا، تو ایک بات تھی۔ انتہی

جواب: اس روایت کے جملہ "لاندری ما قبلها من دبرها" پر آں جناب کا اظہارِ تعجب عجیب ہے، کیوں کہ اس جملہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ بالوں کے طول اور کثرت کی وجہ سے اس جانور کا آگا پیچھا پتہ نہیں چل رہا تھا، قبل اور دبر کا استعمال آگے پیچھے کے معنی میں بھی ہوتا ہے صرف عضو مخصوص ہی میں نہیں، اکثر روایات میں: "لا یدرون أرجل هو أم امرأة" کے الفاظ آئے ہیں، تو جب بالوں کی کثرت کی وجہ سے اس کے مذکر و مؤنث کی تمیز نہیں ہو پا رہی تھی، تو پھر یہ کیسے فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کے قبل و دبر نظر آنے کے باوجود ان دونوں میں امتیاز مشکل ہو رہا تھا، اور اگر یہ جملہ بالفرض عجیب ہو بھی تو کیا یہ چیز پوری حدیث کے قطعاً ناقابل اعتبار ہونے کے لئے کافی ہوجائے گی؟

اصل عبارت:

(۹) نیز یہ لوگ بڑے مضبوط دل کے تھے کہ نہ جساسہ سے خوفزدہ ہوئے نہ دجال

سے، بڑے اطمینان سے دونوں سے باتیں کرتے رہے، حالانکہ ایسی صورت میں انسان حواس باختہ ہوجاتا ہے اور چھٹی گم ہوجاتی ہے۔ (انتہی)

جواب: اولاً یہ بتایا جائے کہ بالکل خوف زدہ نہ ہونے اور مکمل اطمینان کی بات روایت کے کس جزء سے معلوم ہورہی ہے؟ پھر جب تمیم داری کے رفقاء سفر کی تعداد تقریباً تیس تھی، تو اس بڑی جماعت کا جساسہ سے خوف زدہ نہ ہونا قرین قیاس ہے، ہاں اگر ایک یا دو افراد ہوتے تو اس عجیب وغریب جانور سے خوف زدہ ہوکر حواس باختہ ہوجانے کی بات کہی جاسکتی تھی، علاوہ ازیں صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں: "لما سمت لنا رجلا فرقنا منها" جس سے معلوم ہورہا ہے کہ وہ لوگ دوران گفتگو پورے اطمینان سے نہیں تھے بلکہ ایک حد تک خوف زدہ بھی تھے تو اپنی جانب سے بالکل خوف زدہ نہ ہونے اور بڑے اطمینان کے ساتھ الخ کا اضافہ کرکے روایت کی تغلیط کیا پسندیدہ عمل کہا جاسکتا ہے؟

اصل عبارت:

(۱۰) حضرت تمیم داری وہ صحابی ہیں جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جمعہ سے پہلے بیان کی اجازت ملی تھی.... اگر یہ واقعہ خود حضرت تمیم داری کا تھا تو ایسا عجیب واقعہ مقرر بار بار بیان کرتا ہے الخ (انتہی)

جواب: عرض ہے کہ کیا کسی حدیث کے صحیح ہونے کے لیے، خواہ اسی میں کوئی عجیب بات ہو، یہ بھی ضروری ہے کہ اسے بار بار بیان کیا جائے؟ اور اگر حدیث کی صحت کے لیے محدثین کے یہاں یہ شرط بھی ملحوظ ہے تو اس کی نشان دہی کی جائے، محض اپنی جانب سے شرائط کا اضافہ کرکے کسی صحیح حدیث کو غلط نہیں کہا جاسکتا۔

جہاں تک حضرت فاطمہ بنت قیس کے تفرد کا ذکر ہے تو اس سلسلے میں حافظ الدنیا کی درج عبارت ملاحظہ ہو: وقد توهم بعضهم ان حديث فاطمة بنت قيس فى قصة تميم فرد، وليس كذلك، فقد رواه مع فاطمة بنت قيس ابوهريره وعائشة وجابر رضى الله عنهم.

اما حديث عائشة فهو حديث فاطمة المذكور عن الشعبى، قال: ثم

لقيت القاسم بن محمد فقال: اشهد على عائشة حدثنى كما حدثت فاطمة بنت قيس.

واما حديث جابر فاخرجه ابو داؤد بسند حسن.

واما حديث فاطمة بنت قيس فاخرجه مسلم، وابوداؤد بمعناه، والترمذى وابن ماجه، وقال الترمذى: حسن صحيح الى آخره. ان سب باتوں کے بعد بھی کیا تفرد ہونے کی بات درس ہوگی؟

اصل عبارت:

(۱۱) اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ آباد جزیرہ کا وہاں پورا گاؤں بسا ہوا تھا۔ اب ذرائع معلومات وسیع ہوگئے ہیں آخر یہ جزیرہ کہاں ہے؟

جواب: یہ عجیب وغیرب سوال ہے جس کی بناء پر حدیث کی تغلیط فرمائی جارہی ہے۔ کیا اسی طرح کی باتیں ملحدین اور مستشرقین نے قرآن میں بیان کردہ قوموں اور اس میں ذکر کردہ مقامات کی بابت کہہ کر قرآن کی تغلیط نہیں کی ہے۔ کیا اس کی وجہ سے قرآن کی تغلیط کردی جائے گی۔ اس کے بعد آنجناب کا ارشاد ہے "اور وہ لوگ جب راستہ بھول گئے تھے تو اس جزیرہ سے واپس کیسے لوٹے ہیں"۔ کیا حدیث کی صحت اس بات پر موقوف ہے کہ معلوم ہو کہ کیسے لوٹے۔

گذارش

"النصح للمسلم" کے طور پر میرے ذہن میں دو تین باتیں تھیں، جن پر بالمشافہ آپ کی توجہ مبذول کرانا مناسب سمجھتا تھا مگر زبانی گفتگو پر آپ کی عدم آمادگی کے سبب مجبوراً بذریعہ تحریر وہ باتیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

۱- کسی حدیث کو غلط قرار دینے کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ جمہور علماء ومحدثین کا ہے، جو اصول حدیث کی کتب میں بالتفصیل مذکور ہے۔ دوسرا طریقہ منکرین حدیث، ملحدین اور معتزلہ وغیرہ کا ہے، جس میں خود ساختہ تناقضات اور اپنی عقل کے خلاف پر مبنی اعتراضات

پر ہوتا ہے، جو شخص جس فریق کا طریقہ اختیار کرتا ہے، بالآخر انھیں میں جا ملتا ہے۔

۲- اللہ جل شانہٗ کے فضل وکرم سے ہم ایک ایسے ادارے سے وابستہ ہیں، جس کے متعلقین کے لیے اہل سنت والجماعۃ اور حنفی المسلک ہونے کے ساتھ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہما کا ہم مشرب ہونا بھی ضروری ہے، حتیٰ کہ اس ادارے سے اکتساب فیض کرنے والے طلبہ سے بھی بوقت داخلہ اس کا عہد لیا جاتا ہے، ایسے میں اگر آپ کی کوئی تحقیق ان حضرات کے نظریہ کے خلاف ظہور میں آتی ہے، تو ایمانداری اور دیانت کا تقاضہ یہی ہے کہ آپ پہلے اس ادارے کے مشرب ونظریہ کے محافظوں کی خدمت میں وہ تحقیق پیش کرنے کے بعد بیان کریں یا شائع کریں، خاص طور پر اگر وہ تحقیق جمہور امت کے نظریہ کے خلاف ہو تو یہ ذمہ داری مزید اشد ہو جاتی ہے۔

(ز) ۳- حضرات ائمہ حدیث کا یہ متفقہ طرز عمل ہے کہ وہ کسی حدیث کی تضعیف وتصحیح ظن غالب کی بنیاد پر کرتے ہیں حتیٰ کہ کسی حدیث پر وضع کا حکم بھی غالب ظن کی بنیاد ہی پر لگاتے ہیں، جبکہ حدیث جساسہ کے ناقابل اعتبار ہونے کو آپ قطعیت کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، عرض ہے کہ حدیث رسول ﷺ کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس لیے حدیث پاک پر گفتگو کے وقت اس کی نزاکت کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے، تھوڑی سی بے توجہی سے آدمی خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق ہو جاتا ہے۔ اعاذنا اللّٰہ منہ.

والسلام والعاقبة للمتقين

❁ ❁ ❁

تشریح: یہ حدیث قتادہ رحمہ اللہ امام عامر شعبی رحمہ اللہ سے، اور وہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں، اور مسلم شریف (حدیث ۲۹۴۲ کتاب الفتن) میں قتادہ کے چار متابع ہیں: عبداللہ بن بریدۃ، غیلان بن جریر، ابوالزناد اور سیار ابوالحکم، یہ چاروں حضرات بھی امام شعبی سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں، پس یہ متابعتِ تامہ ہے۔ اور ابوداؤد (حدیث ۴۳۲۵ کتاب الملاحم) میں ابوسلمہ اور مجالد بن سعید کی روایت ہے، یہ دونوں بھی حضرت فاطمہؓ سے یہ حدیث روایت کرتے ہیں۔ پس یہ دونوں عامر شعبیؒ کے متابع ہیں۔ اور ابوداؤد (حدیث ۴۳۲۸) میں ابوسلمہ حضرت جابرؓ سے بھی یہ حدیث روایت کرتے ہیں، پس یہ حضرت فاطمہؓ کی حدیث کے لئے شاہد ہے، اس لئے یہ روایت سند کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔

یہ روایت ترمذی، مسلم اور ابوداؤد کے علاوہ اور کتابوں میں بھی ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے نہایۃ البدایۃ والنہایۃ (جلد اول، صفحہ ۹۳) میں اس حدیث کو اس کے تمام طرق کے ساتھ جمع کیا ہے۔ وہاں حاشیہ میں کتاب کے محقق شیخ محمد نعیم ابوعبیہ (رئیس بعثۃ الازہر الشریف بلبنان) نے اس حدیث پر سخت تنقید کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

هذا الحديث عليه طابع الخيال وسمة الوضع، الأمر الذى يجعلنا تنفى صدوره عن الرسول عليه السلام، الذى لايقول إلا الحق، ولا ينطق عن الهوى، ولو صح صدوره عن الرسول، وعلى المنبر، وفى حشد من الصحابة الكرام: لتوا تر نقله، واتفقت كلمة الرواة على روايته، ولكان فى إطار الحكمة النبوية الهادية، والكلمة المحمدية الحق، ولما كان على ما هو عليه، ولا على بعض منه.

مگر ابوعبیہ صاحب کی یہ تنقید محدثین کے اصول کے مطابق نہیں، اس تنقید پر خیال کی چھاپ ہے، اور جو بات منبر سے کہی جائے اس کا تواتر کے ساتھ منقول ہونا ضروری نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حدیث إنما الأعمال بالنيات منبر پر خطبۂ جمعہ میں بیان کی تھی، مگر یحییٰ بن سعید انصاری رحمہ اللہ تک اس کی ایک

ہی سند ہے، اور روایت بالمعنی کی صورت میں تو راویوں میں الفاظ کا اختلاف ہو ہی جاتا ہے، پس یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ اس کی وجہ سے حدیث کو موضوع قرار دیا جائے۔

البتہ دو باتیں وضاحت طلب ہیں:

پہلی بات: اگر کوئی یہ سوال کرے کہ وہ جزیرہ جس میں دجال قید ہے: کہاں ہے؟ اب تو انسان کے ذرائع معلومات وسیع ہو گئے ہیں، اور جغرافیہ دانوں نے زمین کا چپہ چپہ چھان مارا ہے!

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اب تک انسان کی رسائی سمندروں کے تمام جزائر تک نہیں ہوئی، صرف فیجی کے ایک ہزار جزائر ہیں، ان میں سے چند جزیروں تک ہی لوگ پہنچے ہیں۔

دوسری بات: دجال والی روایت میں اور ابن صیاد والی روایت میں یک گونہ تعارض ہے، اور تطبیق مشکل نظر آتی ہے۔ بذل المجهود (۱۲:۳۸۹ طبع جدید) میں ہے: قلت: واعلم أن قصة ابن صياد وقصة الدجال في غاية الإشكال والاشتباه إلخ اشکال یہ ہے کہ اگر دجال کسی جزیرہ میں قید ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن صیاد کا امتحان کیوں کیا؟ اس اشکال کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب: ابن صیاد کے امتحان کی روایت مقدم ہے، اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی روایت مؤخر ہے، کیونکہ آپؓ سنہ ۹ ہجری میں مسلمان ہوئے ہیں۔

دوسرا جواب: حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری (۱۳:۳۲۸) میں دیا ہے کہ حقیقی دجال تو وہی ہے جس کو تمیم داری رضی اللہ عنہ نے دیکھا ہے، اور ابن صیاد ایک شیطان تھا جو دجال کی صورت میں ظاہر ہوا تھا، اس لئے اس کی جانچ کرنی پڑی، مگر کوئی واضح بات سامنے نہ آئی۔

ملحوظہ: پہلے تحفۃ الالمعی (۵:۶۲۸-۶۳۰) میں حدیث کی جو تشریح کی گئی تھی وہ صحیح نہیں تھی، وہ نہایہ والے حاشیہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی، پھر غور کرنے پر اس کی سخافت ظاہر ہوئی تو وہ ساری تشریح حذف کر دی گئی، اور اس کی جگہ یہ نئی تشریح لکھی گئی۔